تذکروں کے نوآبادیاتی بیانیے

ڈاکٹر ناصر عباس نیر *

Abstract:
Western influence on Urdu literature is manifold. Not only modern Urdu Criticism is heavily influenced by western thought and western critical tradition but historiography and Tazkiraz (old forms of Urdu criticism) also came under influence of said influence. The question of the validity of the critical significance of Tazkiraz was first raised by Garcein Dettasi, a French orientalist. Whole following discourse on Tazkiraz revolves around the points raised by Dettasi, sometimes in agreement and at times in defiance. This discourse is in spirit colonial: ignores or represses the system of cultural values, Tazkiras were feeding upon for centuries. This article examines the repercussions of colonial discourse on Tazkiras and seeks to establish that Tazkiras are manifestation of Eastern Poetics, constituted by classical Arabic, Persian and Sanskrit critical systems.

اردو تنقید پر مغربی اثرات، کثیر الاطراف ہیں۔ 'مغرب' نے اردو تنقید ہی کو نہیں، اردو تنقید کی تاریخ کو بھی متاثر کیا ہے۔ انیسویں صدی کے ربعِ آخر سے پہلے ''اردو تنقید'' کی جو مخصوص شکل رائج تھی، وہ بھی باندازِ دگر مغربی اثرات کی زد میں آئی ہے۔ ان اثرات کو نشان زد کرنے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ شاید اس لیے کہ انیسویں صدی کے بعد کے اردو ادب اور تنقید کی بالائی اور زیریں سطحوں میں رواں دواں مغربی اثرات کو ان کے اصل تناظر کے ساتھ سمجھنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ''اصل تناظر'' نوآبادیاتی تناظر ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ جدید اردو تنقید کے اکثر مباحث نوآبادیاتی عہد میں سامنے آئے اور انھی کے نتیجے میں جدید اردو تنقید نے بڑی حد تک اپنے خدوخال پائے، بلکہ اس لیے بھی کہ نوآبادیاتی فکر نے اپنی جڑیں اردو تنقید کے اکثر مباحث میں اتاری ہوئی ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ اردو تنقید کو محض 'نوآبادیاتی عہد' کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنا گم راہ کن بھی ہوسکتا ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں سانس لیتے ہوئے ایک غیر نوآبادیاتی طرزِ فکر کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے، لہٰذا نوآبادیاتی تناظر وہیں موزوں ہوتا ہے جہاں نوآبادیاتی فکر نے کسی متن میں جڑیں اتاری ہوئی ہوں۔ دوسری طرف ایک غیر نوآبادیاتی عہد میں بھی نوآبادیاتی فکر کا غلبہ کسی تخلیق کار پر ہوسکتا ہے۔

نوآبادیاتی فکر، فکر کی مخصوص صورت ہے۔ اسے سائنسی، سماجی اور فلسفیانہ فکر سے ممیّز کرنے کی ضرورت

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، اورینٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ہے۔نوآبادیاتی فکر اپنی اصل میں تو سیاسی ہے...اوراس مفہوم میں کہ یہ غلبہ پسند ہے ....تاہم یہ سائنسی،سماجی اور فلسفیانہ فکر کو بھی اپنے مخصوص مقاصد کے تحت بروے کار لاتی ہے۔نوآبادکار اپنے غلبے کے لیے کئی اقدامات کرتا ہے اوراس لیے کرتا ہے کہ وہ مقبوضات پر ہمہ گیر غلبہ چاہتا ہے۔ایک اقدام مقامی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنا ہے۔نو آبادیاتی نظام میں تاریخ سے عمومی دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔یہ دل چسپی پیدا ہی اس وقت ہوسکتی ہے جب مقامی لوگوں میں شناخت کا بحران پیدا کر دیا جاے۔نوآبادکار اس بحران کا سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ہر سماج میں طاقت کے چند مراکز اور Ideological State Appratus ہوتے ہیں (جیسے معیشت،تعلیم،قانون ،عدلیہ،پولیس وغیرہ)جب یہ کسی طبقے کے کنٹرول میں چلے جاتے ہیں تو کسی بھی سماجی صورتِ حال (خواہ وہ بحران ہو یا لوگوں کے عقاید ہوں) کا سیاسی فائدہ اٹھانا آسان ہو جاتا ہے۔مقامی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنے کی کوشش کے طور پر،موجود اور مقامی لوگوں کے لیے مستند بیانیوں کو منسوخ کرنے کا اقدام کیا جاتا ہے۔یہ اقدام کبھی ان بیانیوں کو غلط ثابت کرنے کی صورت ہوتا ہے اور کبھی ان بیانیوں کو گم کرنے کی صورت میں۔بیانیوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے،نوآبادکار کے پاس طاقت کی طبعی (سیاسی،عسکری،معاشی) اور غیر طبعی (اپنا بلند سماجی مرتبہ،علم کے نئے منہاج،اقدار کا نیا نظام) دونوں صورتیں ہوتی ہیں اور انھیں باری باری یا ایک ساتھ بروے کار لایا جاتا ہے۔بیانیوں کو گم کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انھیں ضائع کر دیا جاتا،چرایا اور چھپا دیا جاتا ہے،تاکہ مقامی لوگوں کی ان تک براہِ راست رسائی کو محال بنا دیا جاے اوران کی جگہ،انھی کے نئے بیانیے رائج کیے جائیں۔بیانیوں کو 'منسوخ' کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مقامی لوگ اپنے ماضی سے منقطع یا متنفر ہو جائیں۔اس انقطاع اور تنفر کے نتیجے میں ایک نئی نفسیاتی حالت پیدا ہوتی ہے،جو تاریخ سے نہیں،اپنی تاریخ کے اپنے بیانیوں سے بے زار ہوتی ہے۔یعنی یہ ایک پر پیچ قسم کا نفسیاتی خلا ہوتا ہے،جس میں تاریخ کی ایک قسم (جو تشکیلی ہوتی ہے) کی قبولیت اور دوسری قسم (جو مستند ہوتی ہے) سے تنفر کا میلان ہوتا ہے۔اس حالت کو ہم ''نوآبادیاتی حالت'' کا نام دے سکتے ہیں۔مذکورہ خلا کو نوآبادکار کے بیانیوں سے پُر کیا جاتا ہے۔مقامی لوگ خود اپنے اور اپنے ماضی کے بارے میں نوآبادکار کے بیانیوں پر تکیہ کرنے لگتے ہیں اور'اپنی تاریخ کے اپنے بیانیوں' پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔یہی طرز فکر نوآبادیاتی ہے۔اپنی اصل کے علم کو اپنے آقاؤں سے حاصل کرنا؛اس علم کو مستند خیال کرنا؛اپنے بیانیوں پر شبہ کرنا۔

انیسویں صدی میں ہندستان سے متعلق تاریخی کتب کو انگریزی سے ترجمہ کرنے کا منصوبہ بند اقدام کیا گیا۔مثلاً شاہانِ مغلیہ کی تاریخ کا ایڈن برا کینٹ لائبریری سے ترجمہ کیا گیا۔ہندستان کے جغرافیے سے متعلق کتاب

مرے کی ان سائیکلو پیڈیا آف جیوگرافی سے مرتب کی گئی۔ گارساں دتاسی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس قسم کی کارروائی کے معنی حقیقتاً ہندستان کو وحشی ملک سمجھنا ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب ہے کہ ہم ہندستانیوں کی بہ نسبت ان کے ملک کو بہتر جانتے ہیں۔''

(خطبات، ص۱۹۲)

بعض معاملات میں نوآبادکارانہ ذہنیت کے مالک، نام ور مستشرق دتاسی نے نوآبادکار کی ذہنیت کا درست تجزیہ کیا ہے۔ انگریز نوآبادکاروں اور ان کے تہذیبی حلیفوں نے برصغیر کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کیا۔ اس صورتِ حال کی انتہائی شکل مل کی ہندستان کی تاریخ میں ملتی ہے۔ مل نے پہلی مرتبہ ہندستان کی تاریخ کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کیا۔ اس نے ہندستان کی تاریخ کے تین ادوار قایم کیے: ہندو تہذیب؛ مسلم تہذیب اور برطانوی تہذیب۔ اور یہیں سے ہندستان کی تاریخ، تہذیب، ادبیات، زبانوں کو مذہب کی بنیاد پر سمجھنے کا آغاز ہوا۔ بہ ظاہر یہ عمل تاریخ نویسی کا ایک اصول تھا کہ ہندستان کی طویل تاریخ کو ایک وحدت آفریں، مرکزی قوت کی مدد سے گرفت میں لیا جا سکے۔ ایک عہد کی یہ قوت ہندو تہذیب ہے اور دوسرے عہد کی مسلم تہذیب ہے، مگر یہ اصول نوآبادیاتی مقاصد سے پورے طور پر ہم آہنگ تھا۔ یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہندستان بنیادی طور پر مذہب کے زیر اثر رہا ہے۔ یہاں کے تمام ثقافتی ادارے، ادبیات اور زبانیں مذہبی رجحان کی حامل رہی ہیں۔ (گل کرسٹ نے ''ہندستانی''، یعنی اردو کو مسلم تہذیب سے متاثر قرار دیا اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان ٹھہرایا۔) آگے چل کر اس نقطہ نظر نے جو گل کھلائے، جس طرح کی فرقہ واریت پیدا ہوئی، وہ سب پر عیاں ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ ہندستان کی ثقافت، تاریخ، ادب اور زبانوں کو مقامی زاویے سے سمجھنے کا رویہ پیدا نہ ہوسکا۔ ہندستان کی تاریخ کے تیسرے دور کو عیسائی تہذیب کے بجائے برطانوی دور قرار دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ہندستان کا جدید دور پہلے دو ادوار سے مختلف اور ممتاز ہے۔ برطانویوں نے مذہب کو ایک طرف رکھ کر، ہندستان کی تاریخ کو نیا موڑ دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب یہاں کی عمومی اور ادبی تاریخ کے موجود بیانیوں کو بھی منسوخ کرنے کی کوشش تھی۔

یہ بات اکثر اور پورے تیقن سے کہی جاتی ہے کہ اردو تنقید کا آغاز مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) سے ہوا۔ گویا اس سے پہلے واقعی اردو تنقید کا وجود فرضی، اقلیدس کا خیالی نکتہ اور معشوق کی موہوم کمر ہے۔ (کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، ص۱۰) یہ تیقن دو مفروضوں پر استوار ہے۔ ایک یہ کہ تنقید صرف وہی ہے، جو مقدمہ میں ظاہر ہوئی ہے۔ یعنی تنقید فقط نظری مباحث اور تشریح کا دوسرا نام ہے۔ (اردو تنقید میں تجزیاتی انداز ۲۰ ویں صدی کی تیسری

دہائی میں کہیں جا کرنمودار ہوا۔) تنقید اور تخلیق ایک دوسرے کے متوازی وجودنہیں رکھتے۔ یہ دوسرا مفروضہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب کی تفہیم کے اصولی مباحث اور ادب پاروں کے تجزیاتی مطالعے، تنقید کی اہم شرائط ہیں مگر یہ شرائط ہمیشہ سے نہیں تھیں، یہ شرائط جدید عہد کی تنقید سے وابستہ کی گئی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ آج ان کے بغیر تنقید کا تصور محال اور تنقید کی عمل آرائی ناممکن ہے مگر ہر epistemic age میں ہر ڈسپلن کے الگ اصول ہوتے ہیں۔ اُس عہد میں وہ اصول پوری طرح کارگر ہوتے اور اس عہد کی طلب کی تکمیل کرتے ہیں۔ کسی ایک epistemic age کے علوم کے اصولوں کو دوسری ایج کے اصولوں سے بننے والے معیارات پر پرکھنے سے غلط فہمیاں بلکہ گم راہیاں جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا یہ دعوا کہ انیسویں صدی کے آخری عشرے سے پہلے اردو میں تنقید کا کوئی وجود نہیں تھا، غلط ہے۔ تاہم یہ دعوا بے بنیاد نہیں ہے، اس کی بنیاد ہمارا نوآبادیاتی طرزِ فکر ہے۔ ہم نوآبادیاتی عہد سے شروع ہونے والی تنقید کو حقیقی اور مستقل قدر کی حامل تنقید قرار دینے کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ نوآبادکار مقامی باشندوں کو اپنے ماضی سے منقطع ہونا سکھاتا ہے اور اس عہد کو زرّیں اور جدید عہد کا نام دیتا ہے، جو اس کے آنے سے شروع ہوا۔ اُس سے پہلے کے عہد کو عہد مظلمہ قرار دے کر، اس کے لیے نفرت پیدا کرتا ہے۔

جب یہ دعوا کیا جاتا ہے کہ مقدمے سے پہلے اردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے تو اس کے پیچھے یہ استدلال کارفرما ہوتا ہے کہ تنقید اور تخلیق میں کوئی لازمی رشتہ نہیں (اردو کا تخلیقی ادب بام عروج پر تھا، مگر تنقید کا کہیں وجود نہ تھا) تخلیق، تنقید سے بے نیاز اور تنقید ایک سست الوجود ہستی ہے، جو تخلیق کی ''شورانگیزی'' کے صدیوں بعد کہیں جاگتی ہے۔ یہاں بھی تنقید کا ایک خاص تصور پیش نظر ہوتا ہے جو ایک خاص عہد میں سامنے آتا ہے۔

جب مقدمے سے قبل اردو میں تنقید کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے تو ان تمام تنقیدی و تاریخی بیانیوں کی منسوخی کا اعلان کیا جاتا ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اردو شاعری کے پہلو بہ پہلو موجود تھے اور اردو شاعری کے لیے کارگر تھے۔ یہ بات سرے سے ناقابلِ فہم ہے کہ کوئی تخلیق، تنقید کے بغیر وجود میں آسکے اور برقرار رہ سکے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید تخلیق کے متوازی، موجود ہوتی ہے۔ تخلیقی عمل کے دوران میں اور تخلیق کے وجود میں آنے کے بعد برابر موجود و موثر رہتی ہے۔ تخلیق کو زمانے کی دست برد سے، بچانا بھی تنقید کی ذمے داری ہے۔ وہ کم تر و برتر کا امتیاز پیدا کر کے، اس امتیاز کو ذہنوں میں راسخ کر کے برتر تخلیقات کو محفوظ کرنے کا محرک بنتی ہے۔ اگر یہ محرک موجود نہ ہو تو کوئی تخلیق حافظے یا تاریخ میں موجود ہی نہ رہ سکے، مگر تنقید محض اس تحرک تک محدود نہیں، وہ برتر تخلیقات کی نئی نئی تعبیرات کرتی، نئے تناظر سے انھیں ہم آہنگ کرتی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس دعوے کی تردید میں یونانی تخلیقی دور

(۸تا۵صدی قبل مسیح)،انگریزی تخلیقی عہد(۱۵تا۱۷ویں صدی عیسوی)اوراردو کا تخلیقی دور(۱۶ویں تا۱۹ویں صدی عیسوی) پیش کریں کہ ان زمانوں میں یونانی،انگریزی اوراردو زبان کی بڑی تخلیقات وجود میں تو آئیں،مگر تنقید ان ادوار کے بعد لکھی جانے لگی۔افلاطون اورارسطو چوتھی صدی قبل مسیح،انگریزی تنقید کا باوا آدم ڈرائیڈن ۱۸ویں صدی میں اورمولانا حالی انیسویں صدی میں سامنے آئے۔اصل یہ ہے کہ ان سب حضرات سے پہلے،ان کے متعلقہ خطوں میں بھی تنقید موجود تھی،مگراس کی صورت دوسری تھی۔افلاطون،ڈرائیڈن اور حالی سے پہلے بھی، بالترتیب یونان، انگریزی اوراردو میں تنقیدی تصورات موجود تھے،مگر یہ تصورات یا تو اشاراتی نظام میں وجود رکھتے تھے یا غیرتحریری صورت میں سماجی حافظے کا حصہ تھےاوران زمانوں میں اشاراتی نظام یا غیرتحریری صورتیں،متعلقہ زمانوں کی تخلیقات کے لیے موثر وکارگرتھیں۔یہ ضرور ہے ان کے اثر کی وہ صورت نہ تھی جو آج کل تنقید کے باقاعدہ مکاتب اورتحریری صورتوں میں نظر آتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تب تنقید کے مخاطب تخلیق کار تھےاوراب تخلیق کاروں کے علاوہ ادب کے عام قارئین،سنجیدہ فکرلوگوں سے تنقید کا تخاطب ہوتا ہےنیز زندگی،کلچر،زبان،سماج کے کئی مسایل،تنقید میں شامل ہوگئے ہیں۔

واضح رہے کہ تنقید کی دوجہتیں ہیں۔ایک کوداخلی(Intrinsic)اوردوسری کوخارجی(Extrinsic) کا نام دیا جاسکتا ہے۔داخلی جہت دراصل وہ تنقیدی حس اوراحتسابی شعور ہے، جو ہرتخلیق کار کے یہاں،تخلیقی عمل کے دوران میں اورتخلیقی عمل کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اپنی تخلیق کے سلسلے میں کارفرما ہوتا ہے۔اسی تنقیدی شعور کی راہ نمائی میں تخلیقی مواد،کسی خاص صنف کا قالب اختیار کرتا اور پھراسی کی مدد سےفن پارے کی تراش خراش کی جاتی ہے۔اس تنقیدی شعور کےبھی دو پہلو ہیں۔ہیئتی اورمعنوی۔ایک کاتعلق فن پارے کی ہیئتی جمالیاتی قدر سے ہے۔اسی کی مدد سے جدت اوراختراع پسندی کا مظاہر کیا جاتا ہے۔صنف کے متعینہ اصولوں سے انحراف کیا جاتا اوراپنی انفرادیت کا نقش قایم کیا جاتا ہے۔دوسرا پہلوفن پارے کے مقصد ومعنی سے متعلق ہے۔حقیقتاً دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں، فقط تجزیے کی مدد سے انھیں الگ دکھایا جاسکتا ہے۔تنقید کی خارجی جہت سے مراد وہ طرزفکراوررڈعمل ہے،جس کا مظاہرہ ادب کے عام اورخاص قارئین کرتے ہیں۔یہ گویا سماجی رڈعمل ہے۔اس میں سخن فہمی،ذوقِ سلیم، جمالیاتی اورثقافتی اقدارسب شامل ہیں۔تنقید کی یہ خارجی جہت جب منطقی ارتباط اورتجزیاتی طریق کی علم بردار بنتی ہےتو تنقید بہ طورایک صنف اورشعبہ علم(Discipline) کے قائم ہوتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ تنقید کی داخلی اور خارجی جہت میں کیا ربط ہے؟ آیا وہ تنقیدی شعور جوتخلیق کار کے

یہاں کارفرما ہوتا ہے، وہی باضابطہ تنقید کی شناخت، قدر اور رخ کو متعین کرتا ہے یا تنقید بہ طور ایک شعبہ علم دیگر جمالیاتی، ثقافتی، علمی اور سماجی عوامل کے تال میل سے وجود میں آتی ہے؟ یا ان سب کے امتزاج سے تنقید کی صورت گری ہوتی ہے؟ تاریخِ نقد سے امتزاج کی تائید ہوتی ہے۔ تنقید، معاصر علوم سے گہرا اثر قبول کرتی ہے۔ تنقید مطالعے کے طریقے، تجزیے کے انداز معاصر علوم (بالخصوص سماجی علوم) سے مستعار لیتی ہے۔ چناں چہ علوم میں ترقی وتبدیلی کا اثر تنقید پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم علوم سے اخذ واستفادہ تخلیق کے ہیئتی ومعنوی مطالبات سے جڑا ہوتا ہے۔ یونانی تنقید، انگریزی تنقید اور اردو تنقید کی جدید صورتیں، اپنے زمانوں کے سماجی علوم (سیاسیات، نفسیات، بشریات، لسانیات، تاریخ) اور فلسفے سے بیش از بیش متاثر ہیں۔

یہ درست ہے کہ اردو میں باقاعدہ تنقیدی کتب لکھنے کا رواج، مغربی اثرات کے تحت ہوا مگر یہ درست نہیں کہ مغربی اثرات سے پہلے اردو میں تنقید، موجود ہی نہیں تھی۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس صورت میں موجود تھی؟

مسلم حکم رانوں کے عہد میں ہندستان پر فارسی کا وہی اثر تھا، جو عہد وسطیٰ میں یورپ پر لاطینی کا تھا۔ دونوں زبانیں سیاسی اور ثقافتی اقتدار کی حامل تھیں، اس لیے نہ صرف مقامی زبانوں پر ان کا اثر گہرا تھا، بلکہ مقامی زبانوں کے مقابلے میں انھیں برتری بھی حاصل تھی۔ چناں چہ انھیں علمی زبان کے طور پر اختیار کیا جاتا تھا۔ اردو ادب سے متعلق بیش تر تنقیدی تصورات کا اظہار فارسی (اور کہیں عربی اور کہیں اردو) میں ہوا ہے۔ یہ تنقیدی تصورات تذکروں، انتخابات یا بیاضوں، بلاغت، بیان، بدیع، صرف ونحو، علم حروف کی کتابوں، عروض اور قافیہ کی کتابوں، موازنوں، محاکموں اور ادبی مباحثوں، مجالس شعرا وادبا، تاریخی کتابوں نثری دیباچوں (جن کا رواج عہد مغلیہ میں بہت زیادہ ہو گیا تھا)، علما وادبا کے ادبی خطوط اور دواوین کے اشعار میں ہوا۔ (ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مباحث، ص ۴۵۴-۵) تاہم بعض وجوہ سے تذکرے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ ایک دلچسپ (اور ایک دوسری سطح پر چشم کشا) حقیقت ہے کہ تذکروں کی قدر و قیمت کا سوال نوآبادیاتی عہد میں اٹھایا گیا، اور پہلی بار ایک مستشرق (گارساں دتاسی) نے اٹھایا۔ اب تک تذکروں کی ادبی، تنقیدی اور تاریخی حیثیت پر جو مباحث ہوئے ہیں، ان کے پس منظر میں نوآبادیاتی صورتِ حال اور گارساں دتاسی کی آرا موجود ہیں۔ تذکروں سے متعلق دتاسی کی آرا اوّل اوّل ان کی ہندستانی ادب کی تاریخ (۱۸۳۹ء) میں ظاہر ہوئیں۔ بعد ازاں مولوی کریم الدین احمد اور فیلن کے تذکرے طبقات الشعرا (جو دتاسی کی تاریخ ادب اردو پر ہی مشتمل ہے) میں انھیں دہرایا گیا۔ خطبات میں بھی دتاسی نے تذکروں پر رائے ظاہر کی ہے۔ واضح رہے کہ تذکروں پر اعتراضات خود

تذکرہ نگاروں نے بھی کیے تھے اور اس کا آغاز نکات الشعرا کے بعد ہو گیا تھا، جب فتح علی حسینی گردیزی نے میر کے تذکرے کے جواب میں تذکرہ ریختہ گویاں لکھا تھا، مگر ان اعتراضات کی نوعیت زیادہ تر شخصی ہوتی تھی۔ تذکروں کی تنقید پر کسی تذکرہ نگار نے انگلی نہیں اٹھائی۔ اپنی طرف انگلی اٹھاتے ہی کیوں!!

اب دتاسی کی آرا ملاحظہ کیجیے:

> ''ان تذکروں میں مشہور مولفین اور دوستوں کی مدح سرائی دل کھول کر کی جاتی ہے اور اس حیلے سے انھیں اپنی فصاحت و بلاغت اور انشاپردازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے اور عمدہ عمدہ اشعار انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں........... درحقیقت یہ تذکرے ایک قسم کے منتخبات (یا بیاضیں) ہیں، جن میں شعرا کی زندگی کے حالات پرشکوہ اور شان دار مدح سرائی تک محدود ہوتے ہیں........... ایسے تذکرے ظاہر ہیں عمدہ تنقید کے نمونے نہیں ہو سکتے...........ضمناً ایسی باتیں نکل آتی ہیں، جو ہندستان کی ادبی تاریخ کے لیے اہم ہیں...........ان تذکروں میں خوبیوں کے مقابلے میں عیوب زیادہ ہوتے ہیں۔''
>
> (خطبات، ص ۹-۵۵)

دتاسی کی رائے کے اہم نکات ہیں:

ا۔ معروضیت اور غیر جانب داری کی کمی (مدح سرائی)

ب۔ آرایشی اسلوب اور عبارت آرائی

ج۔ ذوقِ سلیم کا اظہار

د۔ شعرا کے حالاتِ زندگی کا پرشکوہ اظہار

ر۔ معمولی تنقید کے نمونے

س۔ ہندستان کی ادبی تاریخ سے متعلق بعض نادر معلومات

ص۔ بہ حیثیت مجموعی، عیوب زیادہ اور خوبیاں کم ہیں۔

بعد میں تذکروں کی قدر و قیمت سے متعلق جتنی گفت گو ہوئی ہے، وہ بالعموم انھی نکات پر ہوئی ہے۔ ان میں سے بعض کی تائید کی گئی ہے، بعض کی تردید اور بعض کی توسیع کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بجا کہا ہے کہ ''تذکروں

کی تنقید کی ابتدا دتاسی سے ہوئی جس کا ہماری تذکرہ نویسی پر گہرا اثر پڑا۔'' (شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص ۶۵)۔ دوسری طرف حقیقت یہ بھی ہے کہ تذکروں کی تنقیدی اہمیت پر قایم ہونے والا سارا ڈسکورس ہی دتاسی کی آرا کا مرہونِ منت ہے۔ دتاسی نے تذکروں کے تنقیدی، تاریخی، سوانحی عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اسی بات کو منظّم انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جدید اصطلاحات کی رُو سے............ تذکروں میں بیا گرافیکل ڈکشنری (قاموس)، لٹریری ہسٹری (تاریخ ادب) اور لٹریری کرٹسزم (تنقیدی ادب) کے عناصر یک جا مجتمع ہو جاتے تھے۔'' (ڈاکٹر سید عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص ۹۳) دتاسی نے لکھا ہے کہ تذکروں میں خوبیوں کے مقابلے میں عیوب زیادہ ہوتے ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ اسی بات کے ردّ میں کہتے ہیں کہ ''خامیوں کے مقابلے میں خوبیاں زیادہ ہیں۔'' (شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص ۹) دوسری طرف کلیم الدین احمد، دتاسی کی رائے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں ''تذکروں کا عام نقص یہی ہے، ہر جگہ لفظوں کا سیلاب ہے، ان لفظوں سے کوئی خاص باتیں دماغ پر نقش نہیں ہوتیں، ہر نقش، نقش بر آب کی طرح جلد مٹ جاتا ہے'' (اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۲۵) نیز ''تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد اور اس کے صحیح اسلوب سے بھی تذکرہ نویس واقفیت نہ رکھتے تھے۔ (ایضاً، ص ۲۸)

کم و بیش یہی بات گراہم بیلی نے تذکروں کی تنقید سے متعلق کہہ رکھی ہے۔

> "Criticism lends to confine itself to questions of verbal cleverness and linguistic correctness."
> (A History of Urdu Literature, P 102)

حقیقت یہ ہے کہ تذکروں پر کلیم الدین احمد کے تمام اعتراضات اپنی واضح یا نیم واضح شکل میں دتاسی اور ان کے بعد گراہم بیلی اور دوسرے مستشرقین کے یہاں موجود ہیں۔ سیّد عابد علی عابد، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ابوالکلام قاسمی کے یہاں مذکورہ باتوں کی تائید، تردید اور توسیع کی صورتیں ملتی ہیں۔ اس حقیقت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ تذکروں پر ہونے والا اب تک کا ڈسکورس'' ''نوآبادیاتی بیانیے'' (جس کی بنیاد دتاسی نے رکھی) سے شدید طور پر متاثر ہے، لہٰذا مغربی اثرات محض مقدمے سے شروع ہونے والی اردو تنقید پر ہی نہیں پڑے، اس سے قبل لکھی گئی تنقید پر بھی بانداز دگر مرتب ہوئے۔

کیا دتاسی کا بیانیہ واقعی نوآبادیاتی ہے؟ دتاسی کو اردو کا محسن بھی قرار دیا گیا ہے کہ اس نے فرانس میں بیٹھ کر ''ہندوستانی ادب'' کی تاریخ لکھی؛ ''ہندوستانی ادب'' کا سال بہ سال جائزہ لکھا؛ خطبات دیے۔ ان خدمات کا ذکر

عام طور پر تحسین کے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ ہر چند قاضی عبدالودود سے ڈاکٹر تحسین فراقی تک متعدد محققین نے دتاسی کی تحقیقی فروگزاشتوں پر گرفت کی ہے، مسیحی مشنریوں سے اس کی غیر معمولی ہم دردی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، مگر اُس کے بعض بیانات اور آرا کا تجزیہ نوآبادیاتی ذہنیت کی رو سے نہیں کیا گیا۔ نوآبادیاتی ذہنیت نوآبادکاروں کے سائنسی ثقافت کے علم بردار ہونے کے باوجود غیر سائنسی ذہنیت ہے۔ اشیا و مظاہر کا معروضی کے بجائے 'اقداری' مطالعہ کرتی ہے۔ دتاسی نے بھی تذکروں کے معروضی مطالعے کے بجائے، انھیں مغربی تنقیدی اقداری نظام کی روشنی میں دیکھا ہے۔ یہ دو مختلف قسم کے مطالعاتی طرز ہیں۔ اقداری مطالعے میں، ایک اصول یا قدر کو معیار تصور کر کے کسی متن کو پڑھا جاتا ہے۔ اگر متن اس قدر سے ہٹ کر ہے، اس سے متصادم ہے یا اس کے لیے اجنبی ہے تو اسے مسترد کر دیا جاتا ہے۔ مسترد کرنے کی صورت شدید نوعیت کے اعتراضات کی ہوتی ہے۔ جب کہ معروضی مطالعے میں زیر مطالعہ متن کو ہی ایک قدر تصور کیا جاتا ہے۔ چناں چہ اس کی تفہیم کی کوشش کی جاتی ہے اور اس ضمن میں اس کے داخلی تناظر کو ہی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ معروضی مطالعہ، تحسینی مطالعہ نہیں ہوتا۔ یہاں بھی کم زوریوں کی نشان دہی کی جاتی ہے، مگر یہ کم زوریاں اس متن کی اپنی قدر کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی نشانِ خاطر رہے کہ مغربی یا کسی دوسری ثقافت اور کسی دوسرے تنقیدی نظام کی روشنی میں، اردو کی کلاسکی تنقید کے مطالعے میں کوئی قباحت نہیں۔ بہ شرطے کہ یہ مطالعہ تقابل کی غرض سے ہو، اور تقابل میں دونوں کی اقدار کو اوّلاً تسلیم کیا جاتا ہے۔ دتاسی یا دوسرے مستشرقین (اور یہ سلسلہ رالف رسل تک پہنچتا ہے) کے لیے یہ تسلیم کرنا دشوار رہا ہے کہ اقداری سطح پر مشرقی تصوراتِ فن مغربی تصورات کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں۔ نوآبادیاتی فکر نے دونوں ثقافتوں میں جو درجہ بندی کی اور جس کی نوعیت سراسر سیاسی ہے، اس سے شاید ہی کسی مستشرق نے دامن چھڑایا ہو۔ دتاسی کے خیالات کو نوآبادیاتی قرار دینے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ غیر سائنسی اور اقداری نوعیت کے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ آخر وہ اردو زبان کے لیے ہندی، ہندوی یا ریختہ (جو اس زمانے میں اردو کے لیے عام طور پر رائج تھے) کی جگہ ہندوستانی کا لفظ کیوں استعمال کرتا ہے۔ کیا وہ یہاں اپنی فکری نسبت گل کرسٹ سے قایم کرتا نظر نہیں آتا، جس نے غالباً سب سے پہلے ہندی، ریختہ اور اردو کو ہندوستانی کا نام دیا تھا۔ یہ نام گل کرسٹ نے ہندوی کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔ اردو کو ہندوستانی قرار دینے کی وجوہ یک سر نوآبادیاتی تھیں۔ اردو کو ایک نیا 'نوآبادیاتی' تشخص دینے، اسے محض مسلمانوں سے وابستہ کرنے اور ہندوؤں کے لیے اسی زبان کو دوسرے نام سے رائج کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ لسانی فرقہ واریت کے طوفان کی بنیاد رکھی جا سکے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے گل کرسٹ کے ایک اقتباس کے ترجمہ درج کیا

ہے، وہ چشم کشا ہے۔

> ''...اس ملک کی عوامی زبان کے ہمیں اور سب نام مستقلاً ترک کر دینے چاہییں..ان سب کی جگہ ہمیں صرف ''ہندوستانی'' کہنا چاہیے۔ یہاں کے لوگ اس زبان کو''ہندوستانی'' کا نام دیں یا نہ دیں۔ کیوں کہ ان لوگوں میں امتیاز کی صلاحیت مناسب درجے کی نہیں ہے۔ اور اگر اس طرح کے مناسبات اور پابندیاں ان کی توجہ میں لائی بھی جائیں تو وہ ان کو عمل میں نہیں لا سکتے۔'' ہندوی''(Hinduwee) کو میں بلاشرکت غیرے ہندوؤں کی ملکیت قرار دیتا ہوں اور اسی لیے اس اصطلاح کو میں نے ہمیشہ ہندوستان کی قدیم زبان کیلئے استعمال کیا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے حملے کے پہلے یہاں مستعمل تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یہ زبان ہی''ہندوستانی'' کی بنیاد یا زمین کا کام کرتی ہے۔''ہندوستانی''ایک نسبتاً تازہ بالائی تعمیر ہے جو فارسی اور عربی پر مشتمل ہے۔''

(بہ حوالہ، اردو کا ابتدائی زمانہ، ص۲۴، ۲۵)

تذکروں کے انھی پہلوؤں پر اعتراضات داغے گئے ہیں جہاں وہ انیسویں صدی کی مغربی (فرانسیسی اور برطانوی) تنقید کے عمومی اصولوں سے متصادم ہیں یا اجنبی ہیں۔ مثلاً انیسویں صدی کی مغربی تنقید کا عمومی اصول کسی مصنف کی انفرادیت کو واضح کرنے سے عبارت ہے۔ ہر چند ابھی مغربی تنقید میں متن کے تجزیے کی روش پیدا نہیں ہوئی۔ یہ روش رچرڈز اور ایمپسن کے اثر سے بیسویں صدی میں وجود میں آئی، مگر رومانی تنقید کے اثر سے انفرادیت واضح کرنے کے لیے توضیحی اسلوب عام ہے۔ سوانح، تاریخ اور سماجی ماحول سے مدد لے کر انفرادیت واضح کی جاتی ہے اور دوسرے تخلیق کاروں سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں اردو کی کلاسکی تنقید میں موجود نہیں تھیں۔ تذکروں کی تنقید پر بڑا اعتراض ہی یہ ہے کہ یہ کسی شاعر کی انفرادیت نمایاں کرنے سے قاصر ہیں۔

معروضی مطالعہ تذکروں کو برصغیر کے پورے ثقافتی نظام میں رکھ کر دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے، اور اسی بات کے ردّ عمل میں سید عبداللہ نے یہ رائے دی ہے کہ ''پرانے اسلوب انتقاد کو سمجھنے کے لیے اس سارے نظام سے واقفیت پیدا کی جائے، جس کو اس زمانے کا نقاد اپنے لیے بہ طور بنیاد استعمال کرتا تھا۔'' (مباحث، ص۴۵۳) حقیقت یہی اور سائنسی

طرزِفکر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تذکروں کی معنویت کی جانچ اس تہذیبی نظام اور فکر کی روشنی میں کی جائے، جس نے ان تذکروں کو پیدا کیا۔مغربی نوآبادیاتی ذہنیت نے ایک طرف تذکروں کو، ان کے پالن ہار تہذیبی نظام سے کاٹ کر دیکھا اور دوسری طرف دونوں کے رشتے کو مسخ کر کے پیش کیا۔ جب کلیم الدین احمد یہ کہتے ہیں کہ ''غزل کی پراگندگی سے دنیا واقف ہے۔ اس ناگزیر صنفی نقص کی وجہ سے اصول فن کی ترتیب نہ ہوسکی۔'' (اردو تنقید پر ایک نظر، ص۱۰) یعنی تذکروں میں اصول فن کی کمی کی ذمے داری، غزل اور غزل کے شاعروں پر ڈالتے ہیں تو نوآبادیاتی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ تذکروں میں جو اصول فن، اختصار کے ساتھ موجود ہیں، وہ اگر غزل کی دین نہیں ہیں تو غزل کی تفہیم و تحسین کے لیے موثر بہ ہر حال ہیں۔

چوں کہ تذکروں کے معترضین نے انھیں تہذیبی روایت سے الگ کر کے دیکھا ہے، اس لیے اس کے ردّعمل میں اس تہذیبی روایت کی بازیافت کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک، اس تہذیبی روایت میں شعر کو پرکھنے اور جانچنے کے کچھ پختہ معیار موجود تھے۔ یہ معیار مسلم اور عام طور پر جانے مانے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تذکروں میں تذکرہ نگار اجمالاً یا اشارۃً اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔'' (مباحث، ص۴۵۳) یعنی تذکروں کا اختصار، ان کا نقص نہیں، اس تہذیبی روایت کا پیدا کردہ ہے جس کے علم بردار بعض اصولوں پر پختہ اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ روایت بڑی حد تک سمعی روایت تھی۔ مشاعرہ، استاد شاگردی کا ادارہ، داستان گوئی، یہ سب سمعی ادارے تھے۔تنقیدی اصول اس سمعی روایت میں موجود تھے۔ استادی شاگردی کا ادارہ ان اصولوں کے بغیر وجود رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اگر تذکروں کا اختصار، بعض پختہ معیارات کا اجمالاً اظہار ہے تو پھر تذکروں پر انشا پردازی کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی قطعیت سے کہتے ہیں کہ ''یہ (تذکروں کے) الفاظ لفاظی کے تحت نہیں آتے، ہر جگہ ان کا خاص مفہوم ہے۔'' (تنقیدی مطالعے، ص۱۳۳) اور یہی بات اس سے پہلے سید عابد علی عابد نے کہہ رکھی ہے۔ ''تذکرہ نویس جب فصاحت و بلاغت کے کلمات استعمال کرتے ہیں، تو وہ ان کا اصطلاحی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ ہم ان کلمات کو محض عبارت آرائی تصور کرتے ہیں۔''(اصول انتقاد ادبیات، ص ۲۳۹) گویا تذکروں میں ظاہر ہونے والے الفاظ، جیسے شیریں کلامی، عذب البیانی، مضمون رنگیں، طرز تازہ، روانی، نازک خیالی، مضمون آفرینی، معنی آفرینی، انداز، ایجاز، اطناب، تنافر، غرابت اور دیگر کلمات باقاعدہ اصطلاحات ہیں، ان کا واضح مفہوم ان کے برتنے والے، اور ان کے سننے والے اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وحید قریشی نے تذکروں کی اصطلاحات کی پانچ قسمیں

بتائی ہیں۔ (ا) منطق کی کتابوں سے اخذ کردہ اصطلاحات، جیسے تخیل، تصور (ب) معانی و بیان سے متعلق اصطلاحات، جیسے فصاحت، بلاغت (ج) عروض وقوافی کے رسایل سے ماخوذ اصطلاحات، جیسے مربوط گوئی، سرقہ (د) لغات سے اخذ کردہ یا جن کا مفہوم ان کے محل استعمال سے معلوم ہو، مثلاً فکر رنگیں، مرصع خوانی'' (تنقیدی مطالعے، ص۱۳۴) یہ تمام اقسام دراصل تنقیدی مواد کے ان مآخذ پر مبنی ہیں، جن کا ذکر سید عبداللہ نے کیا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک مکمل تنقیدی نظام کی طرح، تذکروں کی تنقید نے متعدد شعبوں سے اکتساب کیا ہے۔ تذکروں کی اصطلاحات جن مآخذ سے آئی ہیں، وہ اسی تہذیبی نظام کا دوسرا نام ہیں جن سے تذکروں کی نمود ہوئی اور جس کو ملحوظ رکھنے پر سید عبداللہ نے اصرار کیا ہے۔

تذکروں کے پس پشت فقط عربی و فارسی کی روایت کو نشان زد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری قطعیت سے کہتے ہیں کہ ''..اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ...ان تذکرہ نگاروں کے سامنے قدیم فارسی تذکروں کے سوا ادبی تنقید، سوانح اور تنقید کے..اصول یا نمونے موجود نہ تھے۔'' (اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص ۷۷)۔ یہ بھی ایک طرح کے نوآبادیاتی جبر کا نتیجہ ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں برصغیر کی تاریخ کو مذہبی زاویے سے دیکھنے کی روش وجود میں آئی تھی۔ لہٰذا مسلم حکم رانوں کے عہد کی ہر سرگرمی کو بھی مذہبی رنگ دینے کی کوشش ملتی ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ برصغیر کی تہذیب اور اس کے تمام مظاہر مذہب سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ فارسی وعربی کو مسلم حکم رانوں اور بعدازاں اسلام سے جوڑا گیا اور پھر اردو پر فارسی کے اثرات (رسم خط اور الفاظ) کو نشان زد کر کے اس کو بھی اسلامی عہد کی پیداوار قرار دے دیا گیا۔ یہ بات گزشتہ صفحات میں دیے گئے گل کرسٹ کے اقتباس سے پوری طرح واضح ہے۔ نتیجے میں اردو زبان، اس کے ادب اور اس سے متعلق تنقید کو صرف اور صرف فارسی اور عربی اور نتیجتاً مسلم اثرات کے دائرے میں مقید کر دیا گیا۔ اردو، اس کے ادب اور اس کے تنقیدی نظام پر مقامی یعنی سنسکرت شعریات کے اثرات کی طرف کہیں توجہ نہ دی گئی۔ اردو زبان اور شاعری پر بھگتی تحریک کے اثرات کو ایک فعال عنصر کے طور پر عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ ان معروضات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اردو پر فارسی کے اثرات نہیں ہیں۔ کلاسکی اردو شاعری کی بیش تر اصناف فارسی سے لی گئی ہیں۔ شعری علامات، تلمیحات بہت کچھ فارسی سے ماخوذ ہے، مگر سنسکرت شعریات کے کئی اصول، مقامی ہندی علامات، تلمیحات کا پورا نظام بھی اردو شاعری میں موجود ہے۔ اسے بری طرح نظر انداز کیا گیا۔ محمد حسین آزاد نے پہلی بار اس طرف توجہ دلائی، مگر اردو نقادوں کے ہاں کلاسکی اردو شاعری کے تنقیدی پیمانوں کے ضمن میں فارسی کی طرف ہی رجوع کرنے کی روایت پروان چڑھی۔

''نظم اردو کے باب میں یہ امر قابلِ اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہیں۔اسی واسطیاس میں اور برج بھاشا میں اس شاخ میں ذومعنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی اور دورِاوّل کے شعرا میں برابر وہی قانون جاری رہا۔''

(آب حیات[مرتبہ:ابرارعبدالسلام]،ص۵۰)

آزاد کی اس رائے کی روشنی میں اردو شاعری کے مطالعے کو نہ صرف آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ اس رائے کو مسترد کر کے،اس طرز کے مطالعے کی راہ بھی مسدود کرنے کی کوشش کی گئی۔اس سے اور کیا کیا نتائج نکلتے ہیں،ان پر سوچنے کی ضرورت ہے۔یہ بات تو خیر بالکل واضح ہے کہ اردو میں مقبول تناظر اور آئیڈیالوجی سے ہٹ کر سوچنے اور تحقیق کرنے کا فقدان حد سے زیادہ ہے۔قسمت کا مارا جب کوئی شخص رائج آئیڈیالوجی سے ہٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے''اردو اور مشرق'' کے عاشق لٹھ لے کر دوڑ پڑتے ہیں۔خدا معلوم اسے کس کس کا ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔آزاد سے اختلاف کرنے والوں میں گیان چند سے لے کر جمیل جالبی تک شامل ہیں۔یہ سب ایہام کو فارسی کے اثرات میں شمار کرتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اردو شاعری اور کلاسکی تنقید کا'اصل تناظر'صرف فارسی ہے۔(اگر کوئی دوسرا تناظر لحاظ میں رکھا جاسکتا ہے تو وہ عربی ہے۔) جالبی صاحب مولوی عبدالحق کی اس رائے کو رد کرتے ہیں کہ ایہام کا رشتہ سنسکرت کے سلیش سے ہے۔ان کے نزدیک ''سلیش اور ایہام میں بنیادی فرق یہی ہے کہ سلیش میں ایک شعر کے تین تین چار چار معنی ہوتے ہیں جب کہ ایہام میں صرف ایک معنی ہوتے ہیں۔یہ ضرور ہے کہ ایہام کا شعر پڑھ کر ذہن دونوں معنوں کی کی طرف جاتا ہے لیکن جلد ہی ایک معنی کو تلاش کر لیتا ہے۔''(تاریخ ادب اردو،ص۱۹۱۔۱۹۲) جالبی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے سلیش کا یہ معنی کہاں سے اخذ کیا ہے۔سلیش کا یہ معنی ادھورا ہے۔سنسکرت میں شلیش النکار کی وضاحت آنند وردھن نے کی ہے۔عنبر بہرائچی نے آنند وردھن کی شلیش کی تعریف کا جو ترجمہ درج کیا ہے،اس سے ظاہر ہے کہ شلیش میں بھی،ایک سے زیادہ معانی کی افزائش کا ذریعہ''ایک ہی لفظ''ہوتا ہے۔

''جہاں ایک ہی لفظ اپنی قوت سے ایک سے زیادہ معانی کو آشکار کرے وہاں شلیش ہوتا ہے۔''

(آنندوردھن اوران کی شعریات۔ص ۹۷)

آگے شلیش کی کئی قسمیں ہیں۔شبد شلیش (ایہام لفظی)؛اس کی بھی دو قسمیں ہیں: سبھنگ اور ابھنگ۔اور ارتھ شلیش (ایہام معنوی)۔ارتھ شلیش میں شعر کے معانی ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

بلاشبہ ایہام اور شلیش میں مماثلتیں موجود ہیں۔ایہام اور شلیش پر ہی موقوف نہیں، فارسی سے ماخوذ دوسری صنعتوں اور سنسکرت کے النکاروں میں گہری مماثلتیں ہیں۔ یہ کیوں کر وجود میں آئیں،(کیا اس لیے کہ دونوں آریائی نسل سے تعلق رکھتی ہیں؟) یہ ایک الگ مطالعے کا متقاضی ہے،مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شعریات پر دونوں کے اثرات ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو شعریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلاسکی عرب اور ایرانی نظری تنقید میں معنی،شعر کے مافیہ میں استعمال کیا گیا ہے،مگر ''یہ تصور کہ شعر کسی شے کے بارے میں ہو سکتا ہے،لیکن اس کے معنی اس کے مافیہ سے زیادہ ہو سکتے ہیں،عربی فارسی شعریات میں نہیں ہیں،ممکن ہے ہمارے یہاں یہ سنسکرت سے آیا ہو۔'' (اردو کا ابتدائی زمانہ،ص ۱۵۶) ایہام گوئی کا زمانہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے۔تب اردو زبان اور اس کی شاعری پر فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی اثرات بھی خاصے گہرے تھے۔یہ اثرات بعد میں بھی بدلی ہوئی شکلوں میں دکھائی دیتے ہیں۔عنبر بہرائچی کی یہ رائے اسی تناظر میں ہے۔

> ''....یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اردو نے بلاواسطہ سنسکرت شعریات سے بھی اثرات قبول کیے؛ کیوں کہ اس کی جڑوں میں شمالی ہند کی علاقائی زبانوں کی شعریات جو براہ راست سنسکرت شعریات سے متاثر تھیں،نے آبیاری کی تھی۔''
>
> (سنسکرت شعریات،ص ۱۵)

یہاں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی جارہی کہ تذکروں کی تنقید فارسی تنقیدی روایت سے الگ ہے۔صرف اس بات پر زور دیا جانا مقصود ہے کہ فارسی کے علاوہ مقامی تنقیدی روایت بھی تذکروں کے تنقیدی اصولوں میں،مضمر حالت میں ہی سہی،موجود ہے۔اور مقامی تنقیدی روایت کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کرنے کی روش کا آغاز نو آبادیاتی جبر کے تحت ہوا۔نو آبادیاتی فکر نے اردو زبان، اس کے ادب اور تنقید کو مذہب سے جوڑ کر دیکھا،اس فکر کو دانستہ یا نادانستہ قبول کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ جب تذکروں کی حمایت کی گئی ،ان میں مضمر تنقیدی اصولوں کی طرف توجہ دلائی گئی تو بھی ''مذہبی زاویہ'' حاوی رہا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق فارسی روایت،منطق کی روایت تھی۔منطق نے شعر گوئی کو شعر سازی کی طرف

جھکا دیا اور علماے معنی و بیان لفظی کاری گری کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔ (تنقیدی مطالعے،ص ۱۳۸) واضح رہے کہ لفظی کاری گری،شعر سازی کے تصور کا منطقی نتیجہ تھا۔یہ کم وبیش وہی نتیجہ تھا جو کسی بھی ادبی تحریک کے دورِ آخر میں سامنے آتا ہے:نظریے کو فارمولہ بنالیا جاتا ہے۔شعر سازی،ایک مکمل نظریہ شعر تھا۔میؔر نے نکات الشعرا کے آخر میں ریختہ کی چھٹی قسم اور اپنی شاعری کو انداز کہا ہے۔''ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم وآں محیط ہمہ صنعتہا است۔تجنیس،ترصیع،تشبیہ،صفاے گفتگو،فصاحت،بلاغت،ادا بندی،خیال وغیرہ۔''(نکات الشعرا،ص ۱۶۱) گویا انداز،میؔر کے یہاں مکمل نظریہ شعر (مثالی اور آفاقی بہ ہر حال نہیں) ہے۔یہ محض اسلوب کے معنوں میں نہیں ہے۔ذوق جب میر کے انداز تک نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں اور غالب اپنے اندازِ بیان کے 'اور' ہونے کا اعلان کرتے ہیں تو انداز کو (اسلوب کے نہیں) اسی نظریہ شعر کے معنوں میں لیتے ہیں،جو میؔر کے پیش نظر تھا اور جس کے مطابق شاعری صناعی یا Making تھی۔صناعی کا تصور بعد میں کاری گری میں بدل یا بگڑ گیا۔میر جن صنعتوں کا ذکر کرتے ہیں وہ (اور ان کے علاوہ جن کا ذکر میؔر نے نہیں کیا) داخلی سطح پر شعر سازی کے عناصر ہیں اور خارجی سطح پر شعر کی پہچان کے اصول ہیں۔شعر سازی اسی وقت،لفظی کاری گری میں تبدیل ہوئی یا فارمولہ بنی جب اس کے فقط آخری مفہوم پر توجہ کی گئی۔ برسبیل تذکرہ،یونانی اور سنسکرت شعریات میں بھی شاعری صناعی تھی۔یونانی میں Poesis کا مطلب Making ہی تھا۔سنسکرت کے النکار کا بھی مفہوم ہے:(کلام کو) سجانے اور بنانے والا۔ شاعری کو صناعی قرار دینے میں غالباً اصل نکتہ یہ مضمر رہا ہے کہ یہ امتیازی،انسانی وصف ہے۔یہ وصف نہ صرف انسان کو اس شرف سے سرفراز کرتا ہے جو کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں،بلکہ انسانوں میں مخصوص انسانوں کو یہ ممتاز کرتا ہے۔اسی لیے میؔر اپنے انداز سے متعلق یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ''ہر کہ رادراین فن طرز خاصے است ایں معنی رامی فہمد،باعوام کارندارم''۔(نکات الشعرا،ص ۱۶۱)

وحید قریشی نے منطق کی قسموں میں فرق نہیں کیا۔یہ نہیں بتایا کہ یہ استقرائی منطق تھی یا استخراجی،مگر اختصار اور عمومیت سے وابستہ ہونے کی بنا پر یہ استخراجی منطق ہی تھی۔تذکروں میں اگر شعرا کی انفرادیت کو واضح کرنے کے لیے تجزیاتی انداز موجود نہیں ہے تو اس کا سبب ظاہر ہے۔استقرائی منطق عمومیت کے بجاے خصوصیت اور انفرادیت کے جائزے میں دل چسپی لیتی ہے۔اردو تنقید میں اس کا آغاز بہ ہر حال مغربی اثرات کے بعد ہوا۔تاہم فکر کا استقرائی طریق یک سر مغرب کی دین نہیں تھا،اردو ذہن نے مغربی کلچر سے دوچار ہونے کے نتیجے میں اس کی بازیافت کی۔

سید عبداللہ اور بعد ازاں حنیف نقوی نے تذکرے کو مرکب صنفِ ادب قرار دیا ہے۔ (حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، ص ۱۱۷) تاریخ، سوانح اور تنقید کا امتزاج! سید عبداللہ ایک طرف تذکروں کی تنقید کی اہمیت کو باور کرانے کی سعی کرتے ہیں تو دوسری طرف جب مذکورہ سہ گانہ عناصر میں درجہ بندی کرتے ہیں تو سوانح/سیرت کو پہلے درجے پر تاریخ کو دوسرے اور تنقید کو تیسرے درجے پر رکھتے ہیں، (شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص ۹۴) اور اس طرح دتا سی سے ہی اتفاق کر لیتے ہیں کہ تذکروں کی اگر کوئی خوبی ہے تو یہ کہ ان سے ادبی تاریخ سے متعلق کارآمد باتیں مل جاتی ہیں۔ سیرت کو اوّلیت دینے کا مطلب، اسے مرکزیت دینا اور دوسرے دو عناصر کو اس کا تابع قرار دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ اور تنقید کو، شعرا کی سیرت کی وضاحت میں کام آنا چاہیے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ مرکزیت تنقید کو حاصل ہے اور دوسرے عناصر اس کے تابع ہیں۔ اور ان پر اتنی ہی توجہ ہے، جتنی ثانوی عناصر پر ہونی چاہیے، نیز انھیں اسی قدر تذکروں میں شامل کیا گیا ہے، جس قدر تذکروں کے تصورِ نقد کا تقاضا تھا۔ اس عہد میں شخصیت اہم ہی نہیں تھی، ''اس نظام میں افراد کی بجائے انواع کی پرداخت ہوتی تھی۔'' (ڈاکٹر وحید قریشی، تنقیدی مطالعے، ص ۱۳۶) لہٰذا جب شخصیت اہم ہی نہیں تو اس کی تشکیل جن تاریخی اور ماحولی عناصر سے ہوئی ہے، ان کے تفصیلی بیان کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے!

اس رائے پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے بعد تذکروں سے تنقیدی راہ نمائی کے بجائے صرف تاریخی معلومات دستیاب ہوتی ہیں اور آج اگر تذکرے ہمارے لیے کارآمد ہیں تو اس لیے کہ ''تذکروں نے ایسے بے شمار فن کاروں کو بے نام و نشان ہونے سے بچا لیا ہے، جن کے کارنامے یا تو کسی وجہ سے مدون نہ ہو سکے یا مدون ہونے کے بعد ضایع ہو گئے............ تذکروں سے متنازع فیہ کلام کی ملکیت کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے............ تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں، جو یقینی طور پر فنا ہو چکی ہیں، یا جن کے بارے میں معلومات کا کوئی اور ذریعہ نہیں............ گویا تذکروں کی ایک عمرانی اور تاریخی اہمیت ہے۔'' (حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، ص، ۱۳۵..۱۳۸) چوں کہ اُس تہذیبی روایت کی بساط ہی اُلٹ گئی، جس نے تذکروں کو جنم دیا تھا، اس لیے ان کی تنقیدی معنویت اسی روایت کے مدفن میں دب گئی، اور تذکروں سے وہ کچھ اخذ کیا جانے لگا (تاریخ و سوانح) جو تذکرہ نگار کی کبھی ترجیح نہ رہے تھے۔ اگر یہ ترجیح ہوتے تو یقیناً دونوں چیزیں مستند ہوتیں! جہاں کہیں یہ ترجیح ثابت ہوئی ہیں، وہاں یہ معلومات درست بھی ہیں اور تفصیلی بھی۔

یہ بات صریحی ہے کہ تذکرے ایک باقاعدہ تنقیدی نظام کے علم بردار ہیں، ہر چند اس تنقیدی نظام کے تمام

عناصر تذکروں میں ظاہر نہیں ہوئے، مگر یہ نظام با قاعدہ شکل میں (اس عہد کی تہذیبی روایت میں) موجود تھا۔ (ڈاکٹر وحید قریشی، تنقیدی مطالعے، ص۱۳۲) آگے چل کر مغربی تنقید کے اثرات نے اس نظام کو بے دخل کیا۔

واضح رہے کہ کسی تنقیدی نظام کا با قاعدہ اور باضابطہ ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ مثالی اور جملہ بہترین عناصر کا علم بردار بھی ہو۔ اس تنقیدی نظام میں یقیناً بعض نقائص تھے، مگر یہ نقائص اصلاً اس روایت سے آئے تھے، جس نے اسے تشکیل دیا تھا۔ استخراجی منطق کے حدود تذکروں کی تنقید کے حدود اور اس کے نقائص، تذکروں کی تنقید کے نقائص ہیں۔ استخراجی منطق نے تذکروں کی تنقید کو سماجی نہیں ہونے دیا، اس تنقید کو لفظ اور لفظ کی دلالتوں پر مرتکز رکھا۔ اس کے صناعانہ کردار پر توجہ کی۔ عربی و فارسی کا تنقیدی نظام طرز بیان کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ ''عربی ہی کی طرح فارسی کی قدیم تنقید بھی معانی، بیان اور بدیع کے گرد گھومتی ہے۔ علم معانی کے اہم ترین مباحث میں سے فصاحت، بلاغت، ایجاز، اطناب، مترادفات اور محاورات وغیرہ آتے ہیں اور علم بدیع سے ہمیں تحسین کلام اور تزئین شعر کے اصول وضوابط کا پتا چلتا ہے۔ علم بیان، اظہار، اسالیب اور ترسیل وابلاغ جیسے اہم مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔'' (ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، ص۲۰۴)

''استخراجی طریقِ کار میں صرف صورت سے بحث ہوتی ہے اور مادہ یا مافیہ سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے۔'' (سی اے قادر، منہاجیات، ص۸۴) مثلاً میرؔ کے یہاں انداز شعر سازی کے داخلی عناصر اور خارجی صورت دونوں کو محیط ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرؔ کا سخن 'چار چار طرفیں' نہ رکھتا اور یہ بات محض تعلّی ہوتی کہ سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا... ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے۔ تذکروں کی تنقید کی 'خرابی' یہ ہے کہ استخراجی منطق سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یہ شعر سازی کے داخلی عناصر کی توضیح سے قاصر تھی۔ استخراجی منطق، استدلال کی صورت کو اہمیت دیتی اور اس کی صحت (validity) کا خیال رکھتی ہے، اور یہ استدلال جس بنیادی مواد (حقیقت، مشاہدہ وغیرہ) کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس کی طرف عدم التفات ہوتا ہے، اس منطقی طریق کار کا اطلاق بڑی حد تک تذکروں کی تنقید پر ہوتا ہے۔

دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ تذکروں کے مخاطب کون ہیں؟ مخاطب یا قاری صرف وہی نہیں جو متن کا مطالعہ کرتا اور اس کے معانی کا تعین اور تعبیر کرتا ہے بلکہ ایک اور قاری بھی ہے جو ہر مصنف کے تشکیلِ متن کے تمام لمحات میں تخیلی طور پر اس کے روبہ رو رہتا ہے اور اس کے متن کے اسلوب، نظام استدلال وغیرہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تذکروں کے مخاطب اور قارئین عام طور پر شعرا ہیں۔ بیش تر تذکرے بھی خود شعرا ہی نے لکھے ہیں۔ اسی لیے تذکروں میں شعر سازی کے اصول اور محاسن ہی پیش ہوئے ہیں۔ تذکروں میں اشعار پر اصلاحیں دینے کا مطلب

ہی یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ :اس طرح کہتے ہیں سخنور سہرا۔لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تذکرے بڑی حد تک ’اشرافیہ‘ تک محدود تھے،اس لیے انھی کی اشرافی یعنی اصطلاحی زبان میں گفت گو کرتے تھے۔اگر تذکروں کے مخاطب عام لوگ ہوتے تو ان میں یہ اختصار ہوتا نہ فقط شعری مسایل ہوتے!

تذکروں کی تنقید ’صورت‘ سے متعلق،مگر مادہ یا مافیہ سے تصریح کی سطح پر غیر متعلق ہے۔مادہ یا مافیہ سے مراد شعری متون کے معنیاتی نظام کی سطحیں،شعر کی تخلیق کے عوامل،شاعری کا سماج یا فرد کی باطنی زندگی سے رشتہ ہے۔ تذکروں کی تنقید،ان تمام باتوں سے صرفِ نظر کرتی ہے،یہ تذکروں کا نقص نہیں،بل کہ تذکروں کے مخاطباتی حدود (Discursive limitations) کے سبب ان کی وہ نارسائیاں ہیں،جنھیں آج کی تنقید درگزر نہیں کرتی۔

جس طرح استخراجی منطق میں بعض اصولوں کو فرض کر لیا جاتا اور ان کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس طرح تذکروں کی تنقیدی اصطلاحات،وہ اصول ہیں،جن کی بنیاد پر شعرا کے محاکمے کیے جاتے اور تنقیدی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں، یعنی تنقیدی فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ استخراجی منطق کی طرح، تذکروں کی اصطلاحات/ اصولوں پر برابر غور نہیں کیا جاتا،انھیں مسلم خیال کیا جاتا ہے۔تذکروں کی تنقید میں جن شعری لوازم کا ذکر ہے،ان میں فارسی محاورات کی صحت،مسلمہ تشبیہات کی پابندی،مسلمات شاعری کا احترام شامل ہے۔ (ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی،مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت،ص۲۰۴) چوں کہ اس منطق میں اصولوں کو فرض اور تسلیم کیا جاتا ہے،اس لیے نئے اصولوں کی تلاش کی جاتی ہے نہ مسلمہ اصولوں کو چیلنج کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تذکروں کی تنقیدی اصطلاحات میں بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے۔مغربی اثرات نے ان اصولوں کو کہیں چیلنج کیا،اور کہیں نوآبادیاتی نظام کی طاقت سے بے دخل کر کے،استقرائی طریق کار کو رائج کیا۔اردو تنقید میں جب استقرائی طریق کار رائج ہو گیا تو تنقیدی اصطلاحات کی کثرت بھی ہو گئی اور ان پر برابر غور و فکر کی روش بھی وجود میں آ گئی۔

آخری بات یہ کہ تذکروں کے نوآبادیاتی بیانیے،تذکروں کے تنقیدی نظام سے صرفِ نظر کرنے،انھیں مسخ کرنے کے مرتکب ہوے ہیں تو غیر نوآبادیاتی بیانیے ان کے تنقیدی نظام کے تکملے ثابت ہوے ہیں۔آخر الذکر بیانیے اردو کی کلاسکی شعریات کو تذکروں کی بنیاد پر مرتب کرنے کی کوششکرتے ہیں اور یہ کوشش دراصل اس مشرقی شعریات کی تدوین کا دوسرا نام ہے،جو ایک مکمل شعری و تنقیدی نظام کے طور پر کارفرما تھی اور جو عربی،فارسی اور سنسکرت شعریات سے بہ یک وقت عبارت ہے۔ابھی اس کوشش کا آغاز ہوا ہے۔اس ضمن میں سید عبداللہ،عابد علی عابد،وحید قریشی،فرمان فتح پوری اور حنیف نقوی کی مساعی اہم ہونے کے باوجود یک طرفہ ہیں۔ان کی نوعیت ردِعمل اور دفاع کی ہے۔ہر چند گوپی چند نارنگ کی کتاب ساختیات،پس ساختیات اور مشرقی شعریات کا آخری حصہ اس جانب اہم قدم ہے،مگر ابھی تذکروں کی تنقید کے غیر نوآبادیاتی تفصیلی مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، (مرتبہ ابرار عبدالسلام)، ملتان، شعبہ اردو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء

۲۔ ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۲ء

۳۔ حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، لکھنؤ: اتر پردیش اکادمی، ۱۹۹۸ء

۴۔ دتاسی، گارسیں، خطبات، اورنگ آباد: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء

۵۔ سی اے قادر، منہاجیات، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰

۶۔ سید عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء

۷۔ سید عبداللہ، مباحث، لاہور:

۸۔ عابد علی عابد، سید، اصول انتقاد ادبیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۹۔ عنبر بہرائچی، سنسکرت شعریات، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۹ء

۱۰۔ عنبر بہرائچی، آنندوردھن اور ان کی شعریات، الہ آباد: پہچان پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۱۱۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاوس، س ن

۱۲۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، اردو کا ابتدائی زمانہ، کراچی: آج، ۱۹۹۹ء

۱۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۸ء

۱۴۔ میر، تقی میر، نکات الشعرا، (مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق)، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء

۱۵۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، لاہور: مکتبہ کاروان، ۱۹۷۶ء

16. T.Grahame Bailey, A History of Urdu Literature, Dehli:Sumit Publications, 1979.